بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یوں تو جماعت اسلامی پر اس کی تشکیل کے وقت ہی سے مہربانوں کی "عنایات" کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن گزشتہ چند سالوں میں ان میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس پر مختلف "کرم فرماؤں" کی طرف سے نئی فرد جرم عائد نہ کی جاتی ہو۔ برسرِ اقتدار طبقے، تجدد پسند حضرات، قادیانیوں، منکرینِ حدیث اور دوسرے اہلِ غرض لوگوں کی طرف سے بے بنیاد الزامات کی یورش کے وجوہ تو پوری طرح سمجھ میں آتے ہیں لیکن ہمیں اُن اصحابِ علم کے تفقہ فی الدین پر حیرت ہوتی ہے جو حالات کی نزاکتوں اور دینی مصالح کو جانتے ہوئے بھی جماعت کو مطعون کرنا بہت بڑی دینی خدمت سمجھتے ہیں۔

الزامات اور اتہامات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں یونہی کسی وقتی جوش اور ہیجان میں بہ کر نہیں گھڑا گیا بلکہ ان کے پیچھے پوری ہوشیاری، چابکدستی اور ہنرمندی کارفرما نظر آتی ہے اور ایک انسان بادنیٰ تأمل محسوس کر لیتا ہے کہ ان کے اندر سنگینی پیدا کرنے کے لیے کتنی مہارتِ فن صرف کی گئی ہے۔

جماعت اسلامی اول روز سے جس مقصد کے حصول کے لیے اپنی بساط کے مطابق سرگرمِ عمل ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کا دین غالب ہو اور اُمتِ مسلمہ اپنے اُس فرض سے باحسن طریق عہدہ برا ہو جو "اُمتِ وسط" کی حیثیت سے اُس پر اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے۔ خدمتِ دین ہی اس جماعت کا واحد مقصد اور جوہرِ حیات ہے اور اسی غرض کے لیے وہ اپنی

ہمت اور قوت کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ اس راہ میں اُسے جس قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اُس سے پوری دنیا واقف ہے۔ اپنوں اور پرایوں کی طعن و تشنیع، فتویٰ بازیاں، املاک کی ضبطی، نہ صرف ارکان بلکہ ہمدردوں اور متفقین تک کی سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے بے دخلی، اور قید و بند کی صعوبتیں کسی دنیاوی مقصد کے لیے برداشت نہیں کی گئیں۔ جو شخص اس ملک کے سیاسی اور معاشی حالات پر نگاہ رکھتا ہے اُس کے لیے یہ چیز سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اگر اس جماعت کے پیشِ نظر کوئی دنیاوی غرض ہوتی یا اس کی جدوجہد کا مقصود سیاسی اور معاشی مفادات کا حصول ہوتا تو اس کے لیے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا کچھ دشوار نہ تھا۔ جس ملک میں سیاسی طالع آزماؤں کو حالات سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ہر وقت میسّر ہوں، اُس میں جماعت اسلامی اگر چاہتی تو بڑی آسانی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیشہ دین کو دنیا پر ترجیح دی اور ہمیشہ ہر قدم دینی نقطۂ نظر سے حالات کا جائزہ لے کر ہی اٹھایا۔ اس راہ میں نہ تو اپنوں کی مخالفت اسے راہِ راست سے ہٹا سکی اور نہ حکومت کا جبر و قہر ہی اس کی راہ کھوٹی کر سکا۔ یہ محض ہمارے مولا کا ہم پر احسان ہے۔ اس کے لیے ہم اُس کے حضور میں جتنا شکر بجا لائیں اُسی قدر کم ہے۔

جماعت کے اس پاکیزہ مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس کی حقیر سی جدوجہد اور ایثار کو سامنے رکھ کر ذرا اُن حضرات کی فنکاری کا اندازہ لگائیں جو اپنا سارا زور اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی حصولِ اقتدار کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتی اور اس طرح وہ دین کے نام پر دُنیا کا کاروبار چمکا رہی ہے۔ یہ بڑا سنگین الزام ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ دین دار لوگوں کی زبان سے یہ الزام سُن کر دل و دماغ کا پورا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ واقعی کیا جماعت اسلامی اور اُس کے امیر دین کے نام پر لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں اور ان کی جدوجہد سے دین کو فائدہ پہنچنے کے بجائے اُسے ناقابلِ تلافی نقصان

پہنچ رہا ہے؟

اِس سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک غیر جانبدار اور مخلص انسان کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ اُن کارروائیوں پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرے جن سے اِہدام دین کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ مگر جماعت کے "دین دار" کرم فرماؤں کی طرف سے اِس جُرم کے ثبوت میں وقتاً فوقتاً جو دلائل و شواہد پیش کیے جاتے ہیں اُن کا جائزہ لینے کے بعد سوائے مایوسی کے کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اُن میں دنیا داروں کے سکھائے ہوئے پراپیگنڈے کے فن سے پُوری طرح استفادہ کیا گیا ہے۔

ان صفحات میں سارے الزامات کی فہرست پیش کر کے ان پر بحث کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے۔ لیکن آج کل محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کے سلسلے میں جماعت اسلامی کو جس طرح دشمنِ دین و ملت ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے اسی سے اس الزام کی صحت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ بالکل واضح بات ہے کہ اسلام نے عورت اور مرد کے دائرۂ کار کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچا ہے۔ عورت کو گھر بلو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور مرد کو اجتماعی ذمہ داریوں کا اہل قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی ریاست کی سربراہی کے لیے دوسری صفات کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ بارِ گراں کسی مرد کے کندھوں پر ہی ڈالا جائے۔ یہ اسلام کا ایک عام اصول ہے اور اسی کی صراحت امیر جماعت اسلامی نے اسلامی ریاست، تفسیر سورۂ احزاب اور اپنی مشہور کتاب "پردہ" میں کی ہے۔ یہ بات ہم کسی جذبۂ فخر سے نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے دائرۂ کار کی وضاحت جس خوبی کے ساتھ جماعت کے لٹریچر میں کی گئی ہے اُس کی نظیر دورِ جدید کے دینی ادب میں نہیں ملتی۔

مولانا محترم نے اس ضمن میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح سو فیصد درست اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اسلام نے عورت اور مرد کے دائرۂ کار کے بارے میں جو اصول دیئے ہیں ہم اُن پر پوری طرح ایمان رکھتے ہیں اور اُن کے اپنانے ہی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم اس بات کے دل و جان سے قائل ہیں کہ کسی اسلامی ریاست میں سربراہی کے منصب پر کسی خدا ترس اور مدبر مرد کو ہی فائز ہونا چاہیے۔ یہ شریعت کا ایک عام قاعدہ ہے جس کا نہ ہمیں کبھی پہلے انکار تھا اور نہ اب ہے۔ لیکن اس اصول کو پوری طرح تسلیم کرنے کے باوجود آج اگر جماعت نے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کا فیصلہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے، جیسا کہ معترضین الزام لگاتے ہیں، کہ ہمیں دین کے مقابلے میں اب دنیا عزیز نظر آنے لگی ہے، یا ہمیں اس قاعدے کی صداقت اور صحت کے بارے میں یقین نہیں رہا، یا سیاسی ہیجان نے ہمارے فکری جہاز بے لنگر کر دیئے ہیں اور اب ہم حالات کے تھپیڑوں کے ساتھ اپنے آپ کو بہنے پر مجبور پاتے ہیں، یا خود غرضیوں نے ہمیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ ہمیں اب اپنی تحریریں نظر نہیں آتیں، یا مفاد پرستی کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ اتنے ماؤف ہو چکے ہیں کہ ہم حق و باطل کے درمیان کوئی تفریق نہیں کر سکتے اور اس وجہ سے شریعت کے اصولوں کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ پامال کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم عام حالات اور خاص حالات کے اُس فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جسے شریعت نے اپنے احکام میں ملحوظ رکھا ہے، اور ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ جن خاص حالات سے اس وقت ہمیں سابقہ درپیش ہے اُن میں ہم کو خود شریعت ہی کے دیے ہوئے ایک دوسرے قاعدے کی پیروی کرنی چاہیے، کیونکہ ان حالات میں عام قاعدے پر اصرار کرنے سے اُن مقاصد کو نقصان پہنچ جانا یقینی ہے جو شریعت کی نگاہ میں زن و مرد کے دائرۂ کار کی تفریق سے اہم تر ہیں۔

دراصل جماعت اسلامی کے موقف کو سمجھنے میں لوگوں کو بار بار جو اُلجھنیں پیش آتی ہیں ان کی

وجہ یہ ہے کہ یہ جماعت محض اصحابِ درس و تدریس یا اربابِ افتاء کا کوئی گروہ نہیں ہے جن کا کام بیانِ مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو عمل کی دنیا میں دینِ حق کو بالفعل قائم کرنے کا نصب العین لے کر اٹھی ہے اور اس نصب العین کے لیے اس کو گوناگوں عملی حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ مزید براں یہ جماعت اب اُس مقام پر بھی نہیں رہی ہے جہاں اس کا کام محض شہادتِ حق کا ابتدائی فریضہ انجام دینے سے زائد کچھ نہ تھا، بلکہ اب یہ ترقی کر کے اُس منزل میں پہنچ چکی ہے جہاں وہ ملک کے نظامِ زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہو سکتی ہے، اور ملک کے لوگ بھی اب اس سے محض بیانِ مسائل سننے کی نہیں بلکہ عملی زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور ان میں رہنمائی دینے کی توقع رکھتے ہیں۔ اس طرح کا نصب العین رکھنے والی ایک دینی جماعت جب اس منزل میں پہنچ جائے تو اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہر پیش آمدہ مسئلے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ دیکھے کہ جن حالات میں وہ مسئلہ پیش آیا ہے ان کی نوعیت کیا ہے اور اُن میں کونسی راہ اختیار کرنا اقامتِ دین کے مقصد تک پہنچنے کے لیے زیادہ انسب ہے۔ اگر شریعت کا ایک قاعدہ اُن خاص حالات میں رُوبعمل نہ لایا جا سکتا ہو، یا اس پر عمل کرنے سے اِس مقصدِ عظیم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو یہ جماعت سخت بے بصیرت ہو گی اگر ایسے مواقع پر خود شریعت ہی کے اُن اصول و قواعد سے رجوع نہ کرے جو قرآن و سُنّت اور کتبِ فقہیہ میں خاص اور غیر معمولی حالات کے لیے پائے جاتے ہیں۔ اِس طرزِ عمل پر اصول سے انحراف کا الزام اگر جاہل لوگ لگائیں تو چنداں موجبِ حیرت نہیں ہے۔ مگر جب اہلِ علم اس طرح کی باتیں کریں تو آدمی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ فقدانِ علم ہے یا کتمانِ علم۔

کیا جماعتِ اسلامی پر الزام لگانے والے اِن حضرات سے کتبِ فقہیہ کے وہ ابواب چھپے ہوئے ہیں جو "دین میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ" کے عنوان پر ہیں؟ کیا وہ تغیّر الفتوی واختلافھا بحسب تغیر الازمنة والامکنة والاحوال والنیات والعوائد کے اہم

اصولی قاعدوں سے ناواقف ہیں؟ اگر وہ ان چیزوں سے بے خبر نہیں ہیں تو براہِ کرم وہ ایمانداری کے ساتھ بتائیں کہ جماعت کے موقف میں وہ اسلام سے کس نوعیت کا انحراف دیکھتے ہیں؟ ہم ایسے حضرات کی خدمت میں بڑے احترام سے گزارش کرتے ہیں کہ براہِ کرم دین کے مزاج اور اور حالات کی حقیقی نوعیت کو سامنے رکھ کر جماعت اسلامی کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں اور پھر دیکھیں کہ آخر اُس کا وہ کونسا ایسا فعل ہے جس سے اِہدام دین کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اگر جماعتِ اسلامی کے حالیہ فیصلے کے بارے میں کسی جدید تعلیم یافتہ شخص کے ذہن میں خلفشار پیدا ہوتا تو یہ چیز کسی اعتبار سے موجبِ حیرت نہ ہوتی۔ لیکن ہمیں حیرت اُن حضرات کی الزام تراشیوں پر ہے جو اسلامی شریعت کے نظام پر پوری نظر رکھتے ہیں، اس کے مزاج کو جانتے ہیں اور اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ اسلام میں بالکل فطری طور پر احکام کے درمیان اہمیت کے اعتبار سے ایک خاص نسبت پائی جاتی ہے اور اس امر کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کسی وقت زمان و مکان کے حالات کی وجہ سے دین کے دو احکام یا اصولوں یا مقاصد کے درمیان عملاً تضاد واقع ہو جائے (یعنی دونوں پر بیک وقت عمل کرنا ممکن نہ رہے) تو شرعی نقطۂ نظر سے کم تر اہمیت رکھنے والی چیز کو زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز کی خاطر اس وقت تک ترک کر دینا چاہیے جب تک دونوں پر ایک ساتھ عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ اسی طرح اسلام میں عام حالات اور خاص حالات کے فطری فرق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے اور خاص حالات میں حقیقی ضروریات یا مجبوریوں کی بنا پر ناگزیر حد تک ایسے کاموں کی رخصت دی گئی ہے جو عام حالات میں ممنوع ہیں۔ اسلام کے یہ اصول جن کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اور جن کے تحت محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کی تائید کی گئی ہے، جماعت اسلامی کے کسی فرد کی ذہنی اختراع نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ اصول ہیں جن پر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر رفقاءِ کار اور ان کی پیروی میں امت کے لاکھوں صلحاء نے عمل کیا ہے۔ ان اصولوں کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں قرآن مجید میں ملتا ہے، ان کی تائید حضور سرورِ دو عالم کی سنت سے ہوتی ہے، آثارِ صحابہ ان کی صحت پر شاہد ہیں اور امت کے

فقہاء نے انہیں بڑی شرح و بسط کے ساتھ مدوّن کیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے علمائے سلف کی تشریحات پیش کرتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا فہمِ قرآن میں جو بلند مرتبہ اور مقام ہے وہ کسی اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "الاتقان فی علوم القرآن" قرآن فہمی کے موضوع پر ایک مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک مقام پر قاضی جلال الدین البلقینی کا یہ قول نقل کیا ہے:

مامن عام الا ویتخیل فیہ التخصیص فقولہ یا ایھا الناس اتقوا ربکم قد یخص منہ غیر المکلف وحرمت علیکم المیتۃ خص منہ حالت الاضطرار و منہ السمک والجراد وحرم الربا خص منہ العرایا۔	کوئی عموم ایسا نہیں جس میں تخصیص کا تصور نہ کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لوگو، اپنے رب سے ڈرو"۔ اس حکم سے غیر مکلف مستثنیٰ ہیں۔ اور یہ حکم کہ "حرام کیا گیا تم پر مردار"، اس سے حالتِ اضطرار اور مچھلی اور ٹڈی مستثنیٰ ہیں۔ اور یہ حکم کہ "حرام کیا گیا سود"، اس سے عرایا مستثنیٰ ہیں۔
(جلد دوم ص ۱۶ مطبعۃ الازہریہ مصر)	

اس کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ قاضی جلال الدین البلقینی کے اس عموم و خصوص کے اصول پر زرکشی نے البرہان میں یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید کی بیشمار آیات ایسی ہیں جن میں کوئی خصوص نہیں، مثلاً وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا، وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا، اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ۔ اس اعتراض کی تردید میں علامہ سیوطی نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ قابلِ غور ہے:

ھٰذہ الآیات کلھا فی غیر الاحکام الفرعیۃ۔ فالظاھر ان مراد البلقینی انہ عزیز فی الاحکام الفرعیۃ وقد	یہ ساری آیات (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) فروعی احکام سے متعلق نہیں ہیں، اور ظاہر بات یہ ہے کہ بلقینی نے جو کچھ کہا ہے وہ فروعی احکام کے

استخرجت من القرآن بعد الفکر اٰیۃ فیھا وھی وقولہ حرمت علیکم امھاتکم الاٰیۃ فانہ لاخصوص فیھا۔

(اتقان۔ جلد دوم ص۱۶)

بارے میں ہے۔ میں نے پورے غور و فکر کے بعد قرآن مجید میں سے صرف ایک آیت ایسی نکالی جو احکام سے متعلق ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں یعنی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ.....

حافظ ابن قیم کا شمار اسلامی شریعت کے معروف ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ اس کے مزاج اور اس کی نزاکتوں اور باریکیوں سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی رائے پر اہلِ علم نے ہمیشہ اعتماد کیا ہے۔ انہوں نے دین میں "مصلحت و ضرورت" کے لحاظ پر جو فکر انگیز بحث کی ہے وہ گہرے غور و فکر کی محتاج ہے۔ جو اہلِ علم اسے دیکھنا چاہیں وہ اعلام الموقعین جلد سوم میں اُسے خود دیکھ سکتے ہیں۔ ہم یہاں اس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے اس اصول کی وضاحت ہوتی ہے:

"زمان و مکان کے تغیُّر، حالات و نیات کے اختلاف اور عرف و عادات کی تبدیلی سے فتویٰ بدل جاتا ہے۔ اس حقیقت کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں بڑے فوائد ہیں اور اس سے ناواقفیت کی بنا پر لوگوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ شریعت کے اندر تنگی اور ناقابلِ برداشت تکلیف کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اسی اصول سے صرفِ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ہماری شریعت میں انسانی مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔"

(اعلام الموقعین جلد سوم ص۲۷)

اس کے بعد علامہ موصوف نے شریعت کے اس اصول کی تشریح میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاءِ کار رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دوسرے صلحاءِ امت رحمہم اللہ کی زندگیوں سے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو حکم دیا ہے کہ وہ برائی ہوتے دیکھے تو اس سے منع کرے۔ مقصود اس حکم کا یہ ہے کہ برائی کرنے والا نصیحت سُن کر برائی کو ترک کر دے

نیکی کا راستہ اختیار کرلے لیکن جب نصیحت کرنے والا یہ محسوس کرے کہ اُس کی نصیحت سے بُرائی میں اضافہ ہوگا تو ایسی حالت میں بُرائی سے منع کرنا خود ممنوع ہے، کیونکہ اگرچہ وہ کام بجائے خود بُرا ہے، مگر منع کرنا اس سے بھی زیادہ بڑی بُرائی کو جنم دیتا ہے۔ مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے منکرات کا ارتکاب ہوتا تھا، مگر آپ اُن کو مٹانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اِس لیے خاموش رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جب مکہ فتح ہوگیا اور وہ دارالاسلام بن گیا تو آپ نے عمارتِ کعبہ میں تغیّر و تبدل کرکے اُسے بنائے ابراہیمی پر قائم کرنے کا عزم فرمایا لیکن قدرت و استطاعت کے باوجود حضور صرف اس اندیشے کی بنا پر اس سے رُک گئے کہ کہیں نومسلم قریشی بدک نہ جائیں اور اسلام کو چھوڑ نہ بیٹھیں۔ اور اسی بنا پر حضورؐ نے حکام کی بُرائیوں کو طاقت سے روکنے کی اجازت نہ دی کیونکہ اس سے عظیم تر بُرائی کے رُونما ہونے کا خطرہ ہے۔"

آگے چل کر علامہ ابنِ قیّم فرماتے ہیں:

"پس انکارِ منکر کے چار درجے ہیں:

(۱) منکر زائل ہو جائے اور اُس کی جگہ معروف قائم ہو۔

(۲) منکر بالکلیہ تو زائل نہ ہو سکے لیکن اس میں کمی ہو جائے۔

(۳) منکر زائل ہو اور اس کی جگہ اسی درجے کا، اسی پیمانے کا دوسرا منکر برپا ہو جائے۔

(۴) ایک منکر کو مٹانے کے نتیجے میں اس سے بدتر اور خطرناک تر منکر اٹھ کھڑا ہو۔

اِن میں سے پہلے دو درجے تو مشروع ہیں، اور تیسرے درجے میں اجتہاد سے کام لے کر فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا اس صورت میں انکارِ منکر کیا جائے یا نہیں، مگر چوتھے درجے میں انکارِ منکر حرام ہے۔ مثلاً ..... اگر تم کسی شخص کو قصّے کہانیوں کی کتابوں میں مستغرق پاؤ تو تمہیں اُسے ان سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن اگر تمہیں اس بات کا خطرہ لاحق ہو کہ اس طرف سے توجہ ہٹا کر وہ بدعت و ضلالت اور طلسم و جادو کی کتابوں کی طرف

رجوع کرے گا تو اسے پہلی قسم ہی کی کتابوں میں مصروف رہنے دو"۔

اسی ضمن میں حافظ ابن قیم نے اپنے استاد امام ابن تیمیہؒ کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز فتنہ تاتار کے زمانے میں استاد محترم کا ایک ایسے مقام پر گزر ہوا جہاں تاتاری شراب پینے میں مشغول تھے۔ ایک رفیق نے انہیں اس برے فعل سے روکنا چاہا لیکن امام صاحب نے اُسے روک دیا اور فرمایا کہ شراب اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے حرام کر دیا ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ شراب کے نشے میں بدمست ہو کر یہ ظالم ایک بڑے فتنے یعنی قتلِ نفوس، سلبِ اموال اور عورتوں اور بچوں پر دست درازی سے رُکے ہوئے ہیں، لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔

(اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۸-۲۹)

حافظ ابنِ قیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت نے منکرات کے درمیان شدت کے اعتبار سے فرق کیا ہے اور اگر کبھی کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ دو برائیوں سے بیک وقت بچنا ممکن نہ ہو، یا ایک برائی سے بچنے کی کوشش ایک زیادہ بڑی برائی کے ظہور کی موجب یقینی نظر آتی ہو تو شریعت نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ انسان ناگزیر حد تک کم تر درجے کی برائی کو زیادہ خطرناک برائی کے مقابلے میں وقتی طور پر گوارا کرے۔ اِس قاعدے کو حافظ عبدالرحمٰن ابن رجب الحنبلی بڑے واضح الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

واذا اجتمع للمضطر محرمان کل منہما لا یباح بدون الضرورۃ وجب تقدیم اخفہما مفسدۃ واقلہما ضررًا لان الزیادۃ لاضرورۃ الیہا فلا یباح۔ (القواعد لابن رجب ص ۲۴۶ - الطبعۃ الاولیٰ - مطبعۃ الصدق الخیریہ بمصر)

جب مضطر کے سامنے دو حرام چیزیں موجود ہوں اور اُن میں سے کوئی ایک بھی بغیر ضرورت کے جائز نہ ہو تو پھر اُس شخص پر یہ واجب ہے کہ وہ اس شے کو مقدم کرے جو فساد کے اعتبار سے ہلکی اور ضرر کے اعتبار سے کم ہو۔ اس لیے کہ جس میں حرمت زیادہ ہے اُس کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں لہٰذا وہ جائز نہیں۔

اس اصول کی صراحت کے لیے انھوں نے یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ اگر احرام کی حالت میں کسی شخص کو

مردار اور شکار کے سوا کوئی تیسری چیز میسر نہ ہو اور وہ انہی دو چیزوں میں سے ایک کے کھانے پر مجبور ہو جائے تو امام احمدؒ کے قول کے مطابق اُسے شکار کو چھوڑ کر مُردار کھا لینا چاہیے، کیونکہ شکار کے کھانے میں اُس شخص کو تین گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑیگا یعنی شکار کرنا، اُس کا ذبح کرنا اور پھر اُس کا کھانا۔ مگر اس کے مقابلے میں مُردار کھانے سے وہ صرف ایک گناہ ہی میں ملوث ہوگا۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں: واذا وجد المحرم صیدًا ومیتةً فانه یاکل المیتة نص علیه احمد لان فی اکل الصید ثلاث جنایات صیده و ذبحه واکله: واکل المیتة فیها جنایة واحدة۔

اسی مسلک کی تائید اصولِ فقہ کے ہر صاحبِ نظر عالم نے کی ہے اور ٹھوس دلائل کے ساتھ اس کی صحت اور صداقت کو واضح کیا ہے۔ علامہ ابن نجیم اپنی فاضلانہ تصنیف الاشباہ والنظائر میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے پہلے یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ الضرورات تبیح المحظورات" ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں (ص ۴۳)، پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عالمِ مجبوری میں مردار کھانے اور حلق میں لقمہ اٹک جانے کی صورت میں اگر شراب کے سوا اور کوئی سیال چیز موجود نہ ہو تو اسے پی لینے اور اگر جان پر آ بنی ہو تو کلمۂ کفر تک زبان سے ادا کرنے کی جو اجازت شریعت میں دی گئی ہے اس کی بنیاد میں یہی اصول کارفرما ہے۔ اس کے بعد علامۂ موصوف شریعت کا ایک دوسرا قاعدہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام (ص ۴۳)	عام نقصان کو دفع کرنے کے لیے خاص نقصان گوارا کر لیا جائے گا۔

اس کی وضاحت میں وہ عمل کی دنیا سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں کسی وقت اگر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان لڑائی چھڑ جائے اور کفار مسلمانوں کے بچوں کو آگے لا کر اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کریں تو مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ اُن پر گولہ باری کریں، خواہ اس سے مسلمان بچوں کا خونِ ناحق ہوتا نظر آئے، کیونکہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا ناگزیر ہے۔ معصوم بچوں پر تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ بلاشبہ ایک بہت بڑا گناہ ہے، اور خاص طور پر جب وہ مسلمان بچے بالکل بے بسی

کے عالم میں غیروں کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے ڈھال کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہوں تو اُن کی حالتِ زار کے تصور ہی سے دل کانپ جاتا ہے، لیکن جب ان کی بے بسی اور مظلومیت سے دشمنانِ اسلام ناجائز فائدہ اٹھا کر امتِ مسلمہ کو زیادہ بڑا نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو پھر ان ننھی ننھی معصوم کلیوں کی بے بسی کو اسلامی لشکر کے راستے میں حائل نہ ہونا چاہیے اور بڑے زیاں سے بچنے کے لیے خون کے یہ گھونٹ گوارا کر لینے چاہییں۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی ایسی دیوار تعمیر کی ہو جو عام لوگوں کے راستہ چلنے میں حائل ہوتی ہو تو اسلامی شریعت کے مطابق با اختیار حاکم اُس شخص کے حقِ ملکیت کو نظر انداز کر کے اُس دیوار کو گرا سکتا ہے۔ اسلام میں حقِ ملکیت کا جس قدر احترام ہے اُس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس حق کی حفاظت میں اگر ایک شخص جان دے دیتا ہے تو اُسے شہادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے لیکن یہاں دیکھیے کہ اگر کسی فرد کا حقِ ملکیت اجتماعی نقصان کا ذریعہ بن رہا ہو تو شریعت اُسے دفع کرنے کے لیے انفرادی نقصان کو گوارا کرتی ہے، کیونکہ وہ اہمیت میں اجتماعی نقصان سے کم تر ہے۔

اسی طرح اسلام لوگوں کو تجارت کی آزادی عطا کرتا ہے اور حکماً قیمتیں مقرر کرنے کو جائز نہیں رکھتا۔ ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ شریعت کے اندر مال فروخت کرنے والوں کو ناحق کسی خاص قیمت پر فروخت کے لیے مجبور کرنا اور ایسی چیز سے انہیں روکنا جو اللہ نے ان کے لیے مباح کی ہے، ظلم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کی تصریح خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے جسے حضرت انسؓ نے اِن الفاظ میں روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ غلہ گراں ہو گیا لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قیمتیں مقرر فرما دیجیے لیکن حضورؐ نے اس سے انکار کرتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ ھو القابض الرازق الباسط المسعر وانی لارجو ان القی اللہ ولا یطالبنی احد بمظلمۃ ظلمتھا ایاہ فی دم ولا مال۔ رواہ ابوداؤد والترمذی	اللہ تعالیٰ ہی بند کرنے والا اور فراخی دینے والا، رزق دینے اور نرخ مقرر کرنے والا ہے، میں چاہتا ہوں کہ جب میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جاؤں تو کوئی شخص اپنے خون اور مال کے معاملے میں مجھ سے

(الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ لابن قیم ص ۲۲۳ المطبعۃ الآداب والمؤید بمصر ۱۳۱۷ھ)

مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔

یہ حکم عام حالات کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ معمول کے مطابق خرید و فروخت کر رہے ہیں اور قیمتیں فطری طور پر چڑھ اور گر رہی ہیں تو اس معاملہ میں حکومت کو مداخلت نہ کرنی چاہیے۔ لیکن خاص حالات میں اگر تاجر ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قحط کی صورت پیدا کر دیں اور عوام کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضروریات زندگی کی قیمتیں جان بوجھ کر بڑھانی شروع کر دیں تو عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تسعیر (حکماً قیمتیں مقرر کرنے) کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس کی تصریح حافظ ابن قیم نے بھی الطرق الحکمیہ میں کی ہے (ص ۲۲۳-۲۲۴) اور علامہ ابن نُجیم بھی اس کے متعلق صاف فرماتے ہیں کہ

ومنها التسعير عند تعدي ارباب الطعام في بيعه بغبن فاحش ومنها بيع طعام المحتكر جبرا عليه عند الحاجة و امتناعه من البيع دفعا للضرر العام۔ (الاشباه والنظائر ص ۴۴ للعلامۃ زین ابن نجیم)

جب غلہ بیچنے والے غلے کی فروخت میں انتہائی بددیانتی سے کام لینا شروع کر دیں تو نہ صرف قیمتیں مقرر کرنا جائز ہے بلکہ ضرورت پیش آئے تو ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کا غلہ جبراً بیچ دینا اور انہیں بیع سے روک دینا بھی ضررِ عام کو دفع کرنے کے لیے جائز ہے۔

علامہ ابن نجیم اور دوسرے فقہاء رحمہم اللہ نے اس ضمن میں احکامِ شریعت کے درمیان تقدیم و تاخیر کے لیے چند مزید اصول بھی بیان فرمائے ہیں جنہیں نگاہ میں رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اُن میں سے ایک اصول یہ ہے:

اذا تعارض مفسدتان روعي اعظمهما ضررا بارتكاب اخفهما۔ قال الزيلعي ...... ان من ابتلي ببليتين وهما متساويتان ياخذ بايتهما شاء وان اختلفا يختار اهونهما۔

جب دو بُرائیوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑ جائے تو لازم ہے کہ جو نسبتاً کم درجے کا مفسدہ ہو اُسے اختیار کر کے دوسرے بڑے مفسدے سے بچا جائے۔ امام زیلعی کہتے ہیں کہ جو شخص دو بلاؤں میں گھر جائے اور وہ دونوں ایک جیسی ہوں تو اُسے اختیار ہے

(الاشباہ والنظائر للعلامۃ ابن نجیم ص ۴۴)

کہ جسے چاہے چُن لے اور اگر اُن میں فرق ہو تو پھر کم درجے کی بلا کو بڑی کے مقابلے میں اختیار کر لیا جائے۔

اس کی مثال امام زیلعی نے نماز کے ایک مسئلے سے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کیجیے کہ کسی شخص کی پیشانی پر زخم ہے اور اس سے پیپ بہتی ہے اب اگر وہ سجدہ کرتا ہے تو اُس کے زخم سے پیپ خارج ہونی شروع ہو جاتی ہے ایسی حالت میں اس شخص کو قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہیے اور صرف اشارے سے رکوع و سجود کرنا چاہیے۔ (الاشباہ والنظائر۔ ص ۴۴)

اور دیکھیے قرآن مجید میں عورت کے پردے کے جو احکام ہیں اُن کی رُو سے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ کوئی شخص کسی غیر محرم عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے لیکن شریعت نے ضرورت کے وقت اسے جائز ٹھیرا دیا ہے چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ھدایہ کے حصہ چہارم، کتاب الکراہیۃ میں اس جواز کا بڑی صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے:

یجوز للقاضی اذا اراد ان یحکم علیہا وللشاھد اذا اراد الشھادۃ علیہا النظر الی وجھہا وان خاف ان یشتہی للحاجۃ الی احیاء حقوق الناس بواسطۃ القضاء واداء الشھادۃ۔

قاضی کے لیے جائز ہے کہ اگر کسی عورت کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے ضرورت ہو یا اس کی گواہی لینی ہو تو اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے، خواہ اس سے شہوانی جذبات پیدا ہو جانے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ ایسا کرنا عدالت اور شہادت کے ذریعہ سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے ضروری ہے۔

یہ اجازت صرف حاکمِ عدالت ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ حکیم اور ڈاکٹر کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: "ویجوز للطبیب ان ینظر الی موضع المرض منہا للضرورۃ" اور طبیب کے لیے بوقتِ ضرورت یہ جائز ہے کہ عورت کے جسم کا وہ حصہ دیکھے جہاں مرض ہو۔

اور اس عبارت کے نیچے شارحِ ہدایہ نے لکھا ہے:

وان کانت تحت السرۃ الی الرکبۃ

اگرچہ وہ مقام زیرِ ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہی کیوں نہ ہو۔

اسی ضمن میں ذرا شمس الائمہ سرخسی کی تصریحات بھی ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ فقہاء کے درمیان

اس اصول کے معاملے میں کتنی ہم آہنگی ہے:

ان المرأة من قرنها الی قدمها عورة۔ هو القياس الظاهر واليه اشار رسول الله صلی الله عليه وسلم فقال المرأة عورة مستورة۔ ثم ابيح النظر الی بعض المواضع منها للحاجة والضرورة فكان ذالك استحسانًا۔ (المبسوط مطبعة السعادة، مصر جلد ۱۰ ص ۱۴۵)

صنفِ نازک سر سے پاؤں تک عورت ہی ہے۔ یہ قیاس ظاہر ہے اور اس کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ "عورت تو عورت مستورہ ہے" لیکن حاجت اور ضرورت کے وقت اس قیاس ظاہر کو چھوڑ کر اس کے بعض اعضاء پر نگاہ ڈالنا جائز کر دیا گیا ہے اور اسی کا نام استحسان ہے۔

یہ استحسانؔ کا اصول ہے جسے فقہاء حنفیہ نے بکثرت استعمال کیا ہے، امام سرخسی اس کی حسبِ ذیل تعریفات اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔

الاستحسان ترك القياس والاخذ بما هو اوفق للناس۔ وقيل الاستحسان طلب السهولة فی الاحكام فيما يبتلی فيه الخاص والعام، وقيل الاخذ بالسماحة وابتغاء ما فيه الراحة وحاصل هذه العبارات انه ترك العسر لليسر وهو اصل فی الدين۔ قال الله تعالٰی يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ وقال صلی الله عليه وسلم خير دينكم اليسر۔ وقال لعلی و معاذ رضی الله تعالٰی عنهما حين وجههما الی اليمن يسرا ولا تعسرا قربا ولا تنفرا (المبسوط مطبعة السعادة مصر جلد ۱۰۔ ص ۱۴۵)

استحسان یہ ہے کہ ظاہر قیاس کسی معاملہ میں جس حکم کا تقاضا کرتا ہو اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کیا جائے جو لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو۔ اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ استحسان ان صورتوں میں سہولت تلاش کرنا ہے جن میں خاص و عام کسی مشکل میں مبتلا ہوں۔ اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کو تلاش کرنے کا نام ہے۔ ان تمام تعریفات کا ماحصل یہ ہے کہ استحسان سے مقصود تنگی سے بچ کر سہولت کی راہ اختیار کرنا ہے اور یہی دین میں اصل قاعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اللہ تمہارے لیے آسانی اور سہولت چاہتا ہے، تم کو دشواری اور مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا" حضورؐ نے بھی فرمایا ہے "تمہارا اچھا دین آسانی ہے" اور حضورؐ نے حضرت علیؓ اور معاذؓ کو جب یمن بھیجا تو فرمایا: "لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا، مشکل میں ڈالنا نہیں، قریب لانا، متنفر نہ کرنا۔"

(باقی ص ۶۵ پر)

(بقیہ اشارات)

علامہ سرخسیؒ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے خاص حالات میں لوگوں کی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور کسی وقت اگر کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے جب دو ناگزیر برائیوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو پھر شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ شدید تر برائی کے مقابلے میں کم تر برائی کو بحد ضرورت گوارا کر لیا جائے۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الجاسوس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے جس سے اس اصول کی حکمتیں اور اس کی مصلحتیں بآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور زبیر اور مقداد بن اسود کو روانہ کیا اور ارشاد فرمایا: تم روضۂ خاخ کے مقام پر جاؤ، وہاں تمہیں اونٹ پر سوار ایک عورت ملیگی۔ اس کے پاس ایک خط ہے، وہ اس سے لینا۔ ہم ارشاد نبویؐ سنتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر چل نکلے یہاں تک کہ روضۂ خاخ کا مقام آگیا ہم نے جب دیکھا تو واقعی ایک عورت اونٹ پر سوار جا رہی تھی۔ ہم نے اُس سے کہا اخرجی الکتاب "خط نکال دے"۔ اس نے کہا ما معی من کتاب "میرے پاس تو کوئی خط نہیں ہے"۔ ہم نے کہا: لَتُخْرِجَنَّ الکتاب او لَتُلْقِیَنَّ الثیاب "تجھے خط نکال کر دینا ہوگا ورنہ ہم تیرے کپڑے اُتار دیں گے"۔ آخر کار اُس نے مجبور ہو کر اپنی چٹیا سے خط نکال کر دے دیا۔

جو حضرات شریعت کے مزاج سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی شرم وحیا کی کس قدر پاسداری کی ہے اور اس معاملے میں اس کے احکام کتنے شدید ہیں کسی عورت کا برہنہ کر دینا تو ایک بہت بڑی بات ہے جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا شریعت تو غیر محرم کی آواز تک کے سننا پسند نہیں کرتی لیکن جب ضرورت لاحق ہوئی تو تینوں مقتدر صحابیوں نے اُسے برہنہ کرنے کی دھمکی دے دی، اور اگر وہ خط نہ دیتی تو وہ ضرور برہنہ کر کے ہی اس کی تلاشی لیتے اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کے سوا اور کیا وجہ بتائی جا سکتی ہے کہ وہ عورت جو خط لیجا رہی تھی وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اُمّتِ مُسلمہ کے لیے ایک عورت کے ستر کو کھولنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ضرر رساں تھا۔ اسی لیے ان تینوں پاکیزہ ہستیوں نے حضور سرورِ کائنات کے ارشاد کے مطابق اُس سے خط حاصل کرنے کی کوشش کی ظاہر بات ہے کہ اس تگ و دو میں انہیں غیر محرم عورت سے ہمکلام بھی ہونا پڑا، اور پھر اُسے برہنہ کرنے کے لیے بھی وہ تیار ہو گئے۔ علامہ بدر الدین عینی اپنی شرح بخاری میں اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(مما یستفاد منه) فیه هتک ستر الجاسوس رجلًا کان او امرأة اذا کانت فی ذلک مصلحة او کان فی الستر مفسدة۔	اس حدیث سے اس امر کا جواز نکلتا ہے کہ جاسوس کو برہنہ کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہو اور ستر نہ کھولنے میں مفسدہ ہو۔

اور دیکھیے اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا قرآن مجید کا کتنا واضح اور صاف حکم ہے اور اس پر اسلامی حکومت میں کتنی سختی کے ساتھ عمل ہوتا رہا ہے خود حضور سرورِ دو عالم کے احساسات اس معاملے میں کتنے شدید تھے اُس کا اندازہ اُس فرمان سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ لیکن خود حضور سرورِ کائنات نے ہی میدانِ جنگ میں اس سزا کو معطل کر دیا۔ حافظ ابنِ قیّم اس حکم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ میں ہاتھ کاٹنے کی سزا سے منع فرما دیا، حالانکہ یہ اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ جنگ میں اس کو منع کر دینے کی مصلحت یہ ہے کہ کوئی مسلمان حمیّت جاہلیہ یا غضب میں آ کر کفار سے نہ جا ملے، اور اس طرح اُس سے ایک ایسے جرم کا ارتکاب ہو جائے جو اللہ کی نظر میں سرقہ کی سزا معطل کر دینے سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔ حضرت عمرؓ حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت حذیفہؓ سے یہی مروی ہے۔ علمائے اسلام میں سے امام احمدؒ، امام اسحٰق بن راہویہؒ امام اوزاعیؒ وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ دشمن کے علاقے میں حدیں جاری نہ

کی جائیں ...... امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تحریری اعلان جاری کیا تھا کہ سپہ سالار جنگ پر اور عام غازی پر بحالتِ جنگ حد جاری نہ کی جائے یہاں تک کہ فوج پلٹ کر گھر آجائے۔ ایسا نہ ہو کہ شیطانی حمیت میں آکر وہ دشمنوں سے جا ملے۔" (اعلام الموقعین جلد سوم ص ۲۹)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون مزاج شناسِ شریعت ہو سکتا ہے اور اُن کے دل سے زیادہ اللہ کی حدود کو قائم کرنے کی تڑپ کس کے دل میں ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے بھی قحط سالی کے وقت چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا کو ساقط کر دیا حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے حضرت سعدی نے سوال کیا "آپ کا فتویٰ بھی یہی ہے" تو آپ نے فرمایا:

"اِن سرق فی مجاعۃ لا نقطعہ" اگر کوئی شخص قحط سالی میں چوری کریگا تو ہم اس کا ہاتھ نہ کاٹیں گے۔"

اسی ضمن میں سعدی نے حضرت حاطب کے غلاموں کے بارے میں خلیفۂ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک فیصلہ نقل کیا ہے حضرت حاطب کے غلاموں نے قبیلۂ مزینہ کی اونٹنی چرالی انہیں دربارِ فاروقی میں طلب کیا گیا انہوں نے اپنی چوری کا اقرار کر لیا۔ آپ نے حضرت حاطب کو بلوایا اور اُن کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا پھر جلّاد سے کہا جاؤ ان کے ہاتھ کاٹ دو جب وہ انہیں لے کر چلا تو آپ نے پھر آواز دیکر انہیں واپس بلوایا اور فرمایا: مجھے معلوم ہے تم ان غلاموں سے انکی حدِ استطاعت سے زیادہ کام لیتے ہو لیکن انہیں بھوکا رکھتے ہو۔ وہ اس اضطرار کی حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ اس وقت ان کے لیے حرام چیز کا کھا لینا بھی جائز ہو جاتا ہے اس وجہ سے میں انکے ہاتھ کاٹنے کا حکم واپس لیتا ہوں اور جب میں نے یہ کیا ہے تو اب میں تم پر گراں قدر جرمانہ ڈالونگا پھر آپ نے مزنی سے پوچھا کہ تمہاری اونٹنی کی زیادہ سے زیادہ کیا قیمت ہے۔ اُس نے کہا چار سو۔ آپ نے فرمایا: جاؤ انہیں آٹھ سو ادا کرو۔

حضرت امام احمد بن حنبل اور امام اوزاعی نے قحط سالی میں قطع ید کو ساقط کر دینے کی تائید کی ہے۔ یہی خالص قیاس ہے اور یہی مقتضائے شریعت ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۵ ص ۲۲-۲۳)

ضرورت کی بنا پر جبکہ وہ ضرورت فی الواقع موجود ہو، اسلامی شریعت کے کسی حکم کا التوا، دین کے اندر کوئی بدعت اور اس کے خلاف کوئی سازش نہیں ہے یہ ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے امت کو دی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدس اور آپ کے پاکباز صحابہ کی زندگیوں میں اس قسم کی رخصتوں کی اہمیت کو اس امت کے تمام ائمہ اور صلحاء نے ہر دور میں پوری طرح نگاہ میں رکھا ہے اور پھر اس کی روشنی میں عوام کو عملی زندگی کے معاملات میں حکیمانہ رہنمائی دی ہے۔

رخصت کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی فعل اپنی اصل کے اعتبار سے ناجائز ہو لیکن بضرورت وہ نابحد ضرورت جائز قرار دیا جائے۔ چنانچہ علامہ سیف الدین آمدی اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں رخصت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الرخصة ما أبيح فعله مع كونه حراما (ص۱۸۸)

رخصت سے مراد یہ ہے کہ ایک فعل کے حرام ہونے کے باوجود اس کا ارتکاب جائز کر دیا جاتے۔

الرخصة ما جاز فعله او ترك الفعل به لعذر مع قيام السبب المحرم ص۱۸۸

رخصت یہ ہے کہ کسی فعل کا ارتکاب یا کسی حکم کی تعمیل کا ترک کسی عذر کی وجہ سے جائز ہو جائے، درآنحالیکہ اس کے اندر حرمت کا سبب موجود ہو۔

اس کی تشریح انہوں نے چند مثالوں سے کی ہے۔ مثلاً عام حالات میں مردار کا گوشت کھانا یا شراب پینا حرام ہے لیکن اگر کسی کی جان خطرے میں ہو اور اس کی زندگی کے بچاؤ کی ان حرام چیزوں کے استعمال کے بغیر کوئی صورت نہ ہو تو پھر حرمت کے باوجود ان سے اس شخص کا بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا بالکل جائز ہے۔ اسی طرح نماز کے لیے وضو ضروری ہے لیکن اگر کسی شخص کو زخم آگیا ہو اور وضو کرنے سے اس کی تکلیف کے بڑھ جانے کا احتمال ہو یا پانی تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو یا پانی اتنا مہنگا ہو کہ وہ اسے خریدنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے بجائے وضو کے تیمم سے نماز ادا کر لینی چاہیے۔

اسی سلسلہ میں فقہاء نے ایک اصول یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اگر ایک انسان کسی وقت ایسے حالات میں گھر جائے جب ایک کام کے کرنے میں اسے مصلحت نظر آتی ہو لیکن اگر وہ اس کے بجائے دوسرا متبادل کام کرے تو اس سے ایک فتنہ دور کیا جا سکتا ہو تو اس لیے یہ لازم ہے کہ وہ مصلحت کے مقابلے میں پہلے فتنہ کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اس اصول کو بیان فرماتے ہوئے علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

درء المفاسد اولى من جلب المصالح فاذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا لان اعتناء الشرع بالمنهيات اشد من اعتنائه بالمامورات ولذا قال عليه السلام اذا امرتكم بشيء فأتوا منه ما استطعتم واذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه (الاشباه والنظائر ص۴۵)

مفاسد کا دور کرنا مصالح کے حصول سے بہتر ہے جب ضرر اور مصلحت کے درمیان کبھی تعارض پیدا ہو جائے تو دفع ضرر کو مقدم رکھنا چاہیے کیونکہ شریعت نے اوامر کے مقابلے میں نواہی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور اسی بنا پر حضور نے فرمایا ہے جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو تمہیں اپنی مقدرت کے مطابق اسے کرنا چاہیے اور جب میں کسی بات سے منع کروں تو تمہیں رک جانا چاہیے۔

یہ ہیں مختصر طور پر وہ اصول جن کے تحت مجبوری کے علم میں احکام شریعت کے اندر تقدیم و تاخیر یا عارضی التوا کیا جا سکتا ہے ہمیں اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا پوری طرح احساس ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسے مفاد پرستوں نے کس اوقات اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ خود حافظ ابن قیم اور دوسرے ائمہ نے اس کی نزاکت کو شدید طور پر محسوس کیا ہے اور ان میں ہر ایک نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ اس استثناء یا التوا سے شدید ضرورت کی حد تک صرف دینی مصالح کے حصول کی غرض ہی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام ہر کہ و مہ اچھی طرح سرانجام نہیں دے سکتا اس کے لیے قرآن حکیم حدیث نبوی، قضایا و فتاوی اصحابہ، مسالک ائمہ مجتہدین اور فقہی مکاتب فکر پر وسیع اور گہری نظر ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو صحت کے ساتھ جاننے کی بھی اشد ضرورت ہے سب سے بڑھ کر یہ نازک کام انہی حضرات کے ہاتھوں سرانجام دیا جا سکتا ہے جو تعلق باللہ، تقویٰ اور تدین کی صفات سے متصف ہوں۔ اور حق یہ ہے کہ یہ آخری وصف ان نازک معاملات کا فیصلہ کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

مگر ان سارے حقائق کو نگاہ میں رکھنے کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شریعت اسلامی نے دینی مصالح کے پیش نظر احکام کے اندر استثناء کی گنجائش رکھی ہے اور اس سے شدید مجبوری کے وقت صرف ضرورت کی حد تک فائدہ اٹھانا دین کے خلاف کوئی سازش نہیں بلکہ اس کی خدمت ہے۔

ہم حیران ہیں کہ جو بزرگ انفرادی زندگی میں شریعت کی عطا کردہ ان رخصتوں سے خود بھی فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اپنے متوسلین کو بھی ان سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتے ہیں انہیں اجتماعی مسائل کے معاملے میں اس اصول کا نام سن کر کیوں وحشت ہوتی ہے۔ اس کی ہمیں صرف ایک وجہ ہی نظر آتی ہے کہ صدیوں کے انحطاط نے ہمیں اسلام کے اجتماعی نظام سے اتنا بے تعلق اور بیگانہ کر دیا ہے کہ ہم نے اس معاملے میں کبھی غور ہی نہیں کیا۔ ہمارے ذہنوں میں جمود و تعطل ہے اس وجہ سے ہم نے کبھی یہ سوچنا ہی گوارا نہیں کیا کہ ملت اسلامیہ کے کچھ اجتماعی معاملات غور و فکر کے محتاج ہیں اور وہ بھی اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم ان کے حل کرنے کے لیے استحسان کے اصول کو نگاہ میں رکھیں۔

آئیے اب دیکھیں کہ جماعت کو آخر کیا مجبوری تھی جس کے تحت اسے اسلام کے ایک عام حکم کے خلاف یہ استثنائی صورت اختیار کرنا پڑی۔ اس ملک میں ایک شخص نے قوم کے اس عظیم اعتماد کو توڑ کر، جو ملت نے اسے اپنے ملک کی حفاظت اور پاسبانی کے معاملے میں سپرد کر رکھا تھا فوج کی مدد سے عنان اقتدار سنبھالی اور اس کے بعد ملک پر ایک جابرانہ نظام مسلط کر دیا۔ جو لوگ اسلام کو صرف "سجدے کی اجازت" تک محدود سمجھتے ہیں ممکن ہے انہیں اس نظام میں کوئی خرابی محسوس نہ ہو لیکن جو لوگ اسلام کے اجتماعی مزاج کا بھی کچھ احساس رکھتے ہیں وہ

ایک استبدادی نظام کی خرابیوں سے ناواقف نہیں ہو سکتے۔

اس شخص نے پورے چھ سال بلا شرکتِ غیرے ملک پر حکمرانی کی اور اس دوران میں احکامِ شریعت کے اندر کھلم کھلا ترمیم و تنسیخ کی اور اس کے خلاف کسی فرد کو زبان کھولنے تک کی اجازت نہ دی جنہوں نے بولنے کی جرأت کی انہیں اس جرم کی پاداش میں تھانوں اور چوکیوں میں بلایا گیا اور وہاں انکی ذلت اور رسوائی کی گئی۔ اگر کسی نے کوئی مقالہ یا مضمون لکھا تو اس کو ضبط کر لیا گیا۔ اور کسی غیرت مند شخص نے اس کے خلاف زبان کھولی تو اُسے نظر بند کر دیا گیا۔ طرح طرح کے جابرانہ قوانین نافذ کیے گئے جن کی بدولت پورا ملک ایک قید خانہ بن کر رہ گیا۔

پھر قوم کے ضمیر کو زندہ اور سیرت کو پختہ بنانے کے بجائے اُس کے اخلاق کا جنازہ نکال دیا گیا، اور لوگوں کی اس انداز سے تربیت کی گئی کہ وہ جری، بہادر اور حق گو بننے کے بجائے خوشامدی، بزدل، ضمیر فروش اور منافق بن کر رہ جائیں۔

اخبارات جو عوام کی تربیت کا مؤثر ذریعہ ہیں ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ پریس آرڈی ننس کی تلوار ان کے سر پر لٹکا دی۔ اشتہارات پر کنٹرول کے ذریعے ان پر مالی دباؤ ڈالا۔ اور پھر بڑے بڑے سرمایہ داروں کے روپے سے پریس ٹرسٹ قائم کر دیا تاکہ آزاد صحافت کے مقابلے میں خوشامدی صحافت کو فروغ دیا جائے۔

اخبارات کے علاوہ عوام کی تربیت کا دوسرا ذریعہ محراب و منبر ہیں لیکن حکومت نے اوقاف کا جو نیا انتظام کیا ہے اس کے نتائج ہر وہ مسلمان دیکھ سکتا ہے جو جمعہ کے دن کسی ایسے امام صاحب کا خطبہ سنتا ہے جو محکمہ اوقاف کے ملازم ہیں۔

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ جو قوم ابھی نئی نئی آزاد ہوئی ہو، اُسے اگر صرف خوشامدی بننے کی تربیت دی جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا اور وہ مستقبل کی تعمیر کیسے کیا کر سکے گی۔

دین و ملت کا مفاد اسی میں ہے کہ اس صورتِ حال کو جہاں تک ممکن ہو جلد از جلد بدلا جائے کیونکہ اس کا جاری رہنا ہر لحاظ سے نقصان دہ ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جس ملک میں بھی کبھی آمریت قائم ہوئی ہے وہاں اُسے انتخابات کے ذریعہ کبھی جمہوریت میں تبدیل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اِسے تو اس ملک اور قوم کی خوش قسمتی سمجھیے کہ یہاں بالکل غیر متوقع طور پر ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے جس میں محض انتخاب کے ذریعہ سے آمریت کو جمہوریت میں بدلنا ممکن ہو گیا ہے۔

ان حقائق کو ذرا نگاہ میں رکھیے اور سوچیے کہ دینی اعتبار سے جماعت اسلامی کے لیے کونسا موقف صحیح ہے۔

ایک صورت یہ تھی کہ وہ صدر ایوب صاحب کی حمایت کا اعلان کرتی اور اس کے سارے نتائج کی ذمہ داری خدا اور خلق کے سامنے اپنے سر لیتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اس فیصلہ کن مرحلے پر بالکل غیر متعلق تماشائی بن کر

بیٹھ جاتی اور دوسروں کو سرے سے کوئی رہنمائی نہ دیتی۔ جو حضرات جماعت کو اس طرح کے مشورے دیتے ہیں انہیں شاید یہ احساس نہیں ہے کہ یہ بھی آمریت کے بقا میں مددگار بننے کی ایک دوسری صورت ہوتی۔ مزید براں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، جماعت اسلامی اب اُس مقام پر نہیں ہے جہاں ملکی معاملات میں اُس کے دخل دینے یا نہ دینے سے حالات پر کوئی خاص اثر نہ پڑتا ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جماعت اپنا ایک وزن رکھتی ہے اور اس کے فیصلے ملکی معاملات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں اگر وہ غیر جانبدار رہتی تو یہ بھی آمریت کے ہاتھ مضبوط کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتا۔ ان حالات میں جماعت اسلامی کے لیے دینی نقطۂ نظر سے مناسب ترین صورت یہی باقی رہ گئی تھی کہ وہ اُن لوگوں سے تعاون کرے جو آمریت کو ختم کرنے اور اسکی جگہ جمہوریت کو بحال کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ صدارت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کا انتخاب جماعت اسلامی نے نہیں کیا بلکہ متحدہ حزب اختلاف کی دوسری چار جماعتوں نے کیا۔ اس فیصلے کے وقت امیر جماعت اور دوسرے زعماء جیل میں تھے۔ جماعت کے سامنے حزب اختلاف کے اس فیصلے کے بعد مسئلے کی حقیقی نوعیت یہ تھی کہ آیا ہم اس اتحاد سے الگ ہو کر خاموش بیٹھ جائیں؟ یا صدر ایوب کے مقابلے میں کوئی دوسرا آدمی کھڑا کر دیں؟ یا محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کریں؟ ان تینوں شکلوں پر پوری طرح غور کرنے کے بعد جماعت کے عمائد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ دینی اور ملی نقطۂ نظر سے اس وقت جماعت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کے سوا کوئی دوسرا جائز طریق کار نہیں ہے کیونکہ پہلی دونوں صورتوں کے اختیار کرنے کے معنی عملاً فیلڈ مارشل صاحب کو کامیاب کرانے اور اس آمریت کے بقا میں ممد معاون ہونے کے ہیں ہم خدا کے سامنے یہ ذمہ داری لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ ہمارے کسی فعل کی وجہ سے یہ آمریت اس ملک میں باقی رہے۔ اس لیے ہم نے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کا فیصلہ کیا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ عورت کا سربراہِ مملکت ہونا دینی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ لیکن ہماری نظروں سے یہ حقیقت بھی مستور نہیں کہ ایک فاسقانہ اور ظالمانہ استبدادی نظام کے بقا میں مددگار ہونا شریعت کی نگاہ میں عورت کو سربراہِ مملکت بنانے سے بدرجہا زیادہ بڑا گناہ ہے۔

جماعت اسلامی اس جدوجہد میں غیر مشروط طور پر نہیں بلکہ واضح شرائط کے ساتھ شریک ہوئی ہے، جن میں ایک بنیادی شرط جمہوریت کی بحالی ہے۔ خود محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اپنی اس سعی و جہد کا مقصد جمہوری نظام کی بحالی اور آمریت کا خاتمہ ہی قرار دیا ہے۔ بطنِ مستقبل میں کیا پنہاں ہے اُس کے بارے میں کوئی شخص بھی وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ہمیں امید ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی سے اس ملک میں فی الواقع آمرانہ رجحانات رکھنے والے اطلاع آزماؤں کے حوصلے پست ہوں گے اور ملک جمہوریت کے راستے پر گامزن ہو سکے گا۔

اس موقع پر ہم ایک اہم حقیقت کو صاف صاف واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے بعض کرم فرما ہم پر جو مختلف الزامات لگا رہے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے تو ہم اسلامی نظام کے قیام کے علمبردار تھے پھر ہم نے اسلامی جمہوریت کے نصب العین کو اپنایا، اور اب صرف جمہوریت کے پرستار بن کر

رہ گئے ہیں حالانکہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں مغربی جمہوریت کو جی بھر کر کوسا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو ہمارے متعلق پھیلائی جا رہی ہے۔ اصل حقیقت جسے لوگ نہیں سمجھ رہے ہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں یہ ہے کہ اس ملک ہی میں نہیں تمام مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام برپا کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اگر کوئی ہے تو وہ مغرب زدہ ذہن رکھنے والوں کی آمریت ہے اور اسلامی نظام کی راہ اگر ہموار ہو سکتی ہے تو وہ ایک ایسی آزاد جمہوری فضا ہی میں ہو سکتی ہے جس میں اسلام کے لیے آزادی کے ساتھ کام کیا جا سکے اور صرف رائے عام کی تبدیلی سے نظام زندگی کو بدلنا ممکن ہو جائے۔ ایسی فضا اگر موجود ہو تو صرف اس ملک میں ہی نہیں بلکہ تمام مسلمان ملکوں میں لازماً اسلامی نظام ہی برپا ہو کر رہیگا، کیونکہ قوم بنیادی طور پر مسلمان ہے اور اس کی رائے عام غیر اسلام کے حق میں ہموار نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ اصل مصلحت ہے جس کی بنا پر ہم اس وقت آمریت کی جگہ جمہوریت کی بحالی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں۔ ہمارے اس موقف کو سمجھنے کے لیے آپ دنیائے اسلام اور خصوصاً اپنے ملک کے حالات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کونسی ہے۔ حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد آپ صرف ایک نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہاں کے عام مسلمان اسلامی نظام کے قیام کے دل و جان سے خواہشمند ہیں اور اسی کی خاطر انہوں نے جان و مال عزت و آبرو کی بیشمار قربانیاں دی ہیں لیکن یہاں جو طبقہ اس راستے میں سب سے زیادہ مزاحم ہو رہا ہے وہ مغرب زدہ طبقہ ہے جسے اتفاقات زمانہ نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ یہ طبقہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس ملک کا انتظام و انصرام عوامی خواہشات کے مطابق چلایا جائے تو یہاں اسلامی نظام کے قیام کو کوئی چیز نہ روک سکیگی اسی لیے اپنے مغربی استادوں کے فلسفہ سیاست کے بالکل برعکس اس کی پالیسی یہ ہے کہ آزادانہ انتخابات کے ذریعہ سے برسر اقتدار آنے کے بجائے حکومت پر بالجبر قبضہ کیا جائے اور پھر ایک آمرانہ نظام قائم کر کے زبردستی اپنی قوم میں مغربی تہذیب کو رواج دیا جائے۔

یہ طبقہ بڑا بااثر ہے۔ ملک کے اندر چونکہ اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے یہ ملکی وسائل کو بے دریغ کے فروغ دینے میں بے تحاشا خرچ کرتا ہے۔ پھر یہ طبقہ شروع ہی سے اس بات کا بھی التزام کر رہا ہے کہ یہاں عوامی خواہشات اور امنگوں کو پنپنے نہ دیا جائے کیونکہ ان کی قوت مغربی تہذیب کے تسلط میں لازماً مانع ہو گی۔

پھر اس طبقے کو اہل مغرب کی پوری تائید حاصل ہے اور وہ آزادی اور جمہوریت کی ان ساری قدروں کو مسلمان ممالک میں برباد کرنے کے درپے ہیں جنہیں وہ اپنے ملکوں میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اسکی وجہ عناد ہے جو انہیں اسلام اور ملت اسلامیہ سے ہے اور اس کا اظہار انہوں نے اپنی مختلف تحریروں اور تقریروں میں بارہا کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان ممالک میں جمہوریت کو نشوونما پانے کا موقع ملا اور یہاں عوامی آرزوؤں اور امنگوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تو پھر یہاں سوائے اسلام کے اور کوئی نظام حیات قائم نہیں کیا جا سکتا۔